ڈاکٹر سعدیہ طاہر
شعبہ اردو، وفاقی اردو یونیورسٹی اسلام آباد

عزیز احمد: ہند اسلامی تہذیب کا تخلیقی مؤرخ

Aziz Ahmad was one of the most prominent fiction writers and literary critics, belonging to the 1930s generation of Urdu writers. In early 1960s he became a fellow of the SAOS, London University and later on moved to University of Toranto, Canada. During his association with the British and Canadian universities his main focus remained on Islam in the Indian sub-continent. His studies in Islamic culture in the Indian environment are distinct because of his creative insights as compared to the books written on the same theme by Dr. Tara Chand, Dr. Ishtiaq Hussain Qureshi and S.M. Ikram. His creative narrative starts from the advent of Islam in the Indian sub-continent to the emergence of Pakistan in 1947 as a natural outcome of socio-political history of the sub-continent.

عزیز احمد عثمانیہ یونیورسٹی میں انگریزی زبان و ادب کے پروفیسر تھے۔ اس دوران تدریسِ ادب کے ساتھ ساتھ وہ تخلیقِ ادب میں بھی سرگرم رہے۔ ناول اور افسانوں کے ساتھ ساتھ انہوں نے ادبی تنقید کے میدان میں بھی یادگار کارنامے سرانجام دیے ہیں۔ اُن کی کتاب ''اقبال.....ایک نئی تشکیل'' اقبال کے فکر وفن کو ترقی پسند اندازِ نظر سے جانچنے اور پرکھنے میں ایک عہد آفریں کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اُن کے ناول ''ایسی بلندی ایسی پستی'' اور ''گریز'' اپنے عہد کے مقبول ترین ناولوں میں شمار ہوتے ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد وہ پاکستان چلے آئے اور کراچی میں حکومتِ پاکستان کے محکمہء اطلاعات میں فلم پبلسٹی کے شعبے میں کام کرتے رہے۔ اِس دوران انہوں نے اُردو نثر میں چند یادگار تخلیقات پیش کیں۔ ملک میں پہلے مارشل لاء کے نفاذ کے بعد وہ یہاں سے دلبرداشتہ ہو کر کینیڈا کی یونیورسٹی آف ٹورنٹو میں تدریس و تحقیق میں مشغول ہو گئے۔ تادمِ مرگ وہ یہیں رہے اور بالآخر یہیں دفن ہوئے۔ ٹورنٹو میں اپنے مستقل قیام سے پہلے لندن یونیورسٹی کے سکول آف اورینٹل اینڈ افریقین سٹڈیز میں بھی رالف رسل کے ساتھ اُردو ادب اور ہند اسلامی کلچر میں دادِ تحقیق و تدریس دیتے رہے۔ یورپ اور شمالی امریکہ کے اس قیام کے دوران انہوں نے انگریزی زبان میں متعدد مقالات اور چند بیش قیمت کتابیں تصنیف کر کے ہند اسلامی کلچر اور ہسپانیہ میں اسلام کے مقدر پر سند کا درجہ حاصل کر لیا۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ عزیز احمد نے ادبی تخلیق اور ادبی تنقید میں ایک قابلِ رشک مقام پیدا کرنے کے بعد تہذیبی تاریخ کی قلم رَو میں قدم رکھا اور یکے بعد دیگرے متعدد یادگار کتابیں تصنیف کیں۔ جن موضوعات پر انھوں نے یادگار تصانیف پیش کیں اُن موضوعات پر اُن کے چند معاصرین اور چند پیش رو مؤرخین نے بھی قابلِ قدر کام کیا ہے۔ جو وصف عزیز احمد کے کام کو ایک نادر و نایاب خصوصیت بخشتا ہے وہ اُن کا تخلیقی انداز اور ادبی مزاج ہے۔ اس کی بہترین مثال ہند اسلامی کلچر پر اُن کی پہلی تصنیف "Studies in Islamic Culture in the Indian Environment" ہے۔ یہ کتاب اُن

کے قیام انگلستان میں شروع ہوئی اور ٹورنٹو یونیورسٹی میں اُن کے قیام کے ابتدائی برسوں میں مکمل ہو کر اشاعت پذیر ہوئی۔ قبل ازیں اسی موضوع پر ڈاکٹر تارا چند کی مشہور کتاب بعنوان "Influence of Islam on Indian Culture" ۱۹۵۹ء میں شائع ہو چکی تھی۔ یہ کتاب انھوں نے ۱۹۲۲ء میں مکمل کی تھی۔اشاعت کے وقت انھوں نے کتاب کے دیباچہ میں اعتراف کیا تھا کہ:

> **"I have sought mainly to collect facts in this essay and facts to be connected with only two aspects of civilisation__religion and art. I am conscious of the inadequacy of the attempt." (1)**

جب اس کتاب کا اُردو ترجمہ شائع ہوا تو ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان نے ڈاکٹر تارا چند کی محنت کی داد دیتے وقت اُن کی غلط فہمیوں کی نشاندہی بھی کی۔ اِس سلسلے میں انھوں نے درج ذیل پانچ غلطیوں کا بطورِ خاص ذکر کیا ہے:

''۱۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے (معاذ اللہ) راہبوں سے تعلیم حاصل کی تھی۔

۲۔ اسلامی تصوف میں ذِکر، توکل، فقر اور رضا وغیرہ عیسائیوں سے ماخوذ ہیں۔

۳۔ طریقت وسلوک، فنا و بقا، کرامت و معجزہ، ہندو ''نروان'' اور ''یوگ'' کی شکلیں ہیں۔

۴۔ عارف جب مقامِ بقا میں پہنچتا ہے تو اس کے لیے شریعت ایک بے معنی چیز بن جاتی ہے۔

۵۔ تصوف نے خدا اور بندے کی عبادت کو ایک ہی حیثیت دی ہے اور شیخ کے آگے سجدہ کرنا سکھایا ہے۔''(۲)

کتاب کے فاضل مترجم محمد مسعود احمد نے چوراسی صفحات پر مشتمل اپنے مقدمے میں انتہائی دقتِ نظر کے ساتھ درج بالا تمام غلط فکر کی مدلّل اور مبسوط تردید کی ہے۔ اسی موضوع پر ایس ایم اکرام کی کتاب "Muslim Civilization in India" ۱۹۶۴ء میں شائع ہوئی تھی۔اس کتاب میں ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے لے کر ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں سے اقتدار چھن جانے تک کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ کتاب کا آخری پیراگراف تہذیبی مستقبل کی جانب یوں اشارہ کرتا ہے:

> **"For understanding the Muslim approach to the problems of the sub-continent it is worth remembering that though revivalist thinkers, like Hazrat Mujaddid Alif Sani in Mughal times and Iqbal in the twentieth century, have exercised a powerful influence, the religious teacher with the greatest following and influence has been Shah Waliullah, perhaps the most catholic and broadminded of religion reformers of the modern Muslim world. A position similar to that of Shah Waliullah in the religious sphere has been occupied by Ghalib in recent times in the literary field. He has been universally popular with Hindus and Muslims, and his poetry reflects a personality of broad sympathies, deep humanity, and liberal views. Amir KHUSRO who laid the foundation of the Indo-Muslim cultural tradition in the pre-Mughal period had the same characteristics. In their writings and in the lives of those whom they influenced, may be found the true spirit of Islamic India during the period which has been covered in this book."(3)**

اِس سے دو سال پیشتر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی کتاب "The Muslim Community of the

"Indo-Pakistan Sub-continent" شائع ہو چکی تھی۔ اِس کتاب میں بھی ہندوستان میں مسلمانوں کے ورودِ سے لے کر قیامِ پاکستان تک اسلامیانِ ہند کے ''درد و داغ وجستجو و آرزو'' کی تفہیم وتعبیر پیش کی گئی ہے۔ اِس کتاب کا ایک نمایاں امتیاز یہ ہے کہ اِس میں جداگانہ مسلمان قومیت کے ظہور، خدوخال اور مقدرّ پر تہذیب کے ساتھ ساتھ سیاسی مسلک کو بھی زیرِ بحث لایا گیا ہے اور بڑے محکم استدلال کے ساتھ قیامِ پاکستان کو تاریخ و سیاست کی ایک زبردست مثبت پیش رفت ثابت کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی اگلی کتاب بعنوان "The Struggle for Pakistan" اِسی کتاب کے تسلسل میں لکھی گئی ہے۔ عزیز احمد کی زیرِ نظر کتاب ۱۹۶۴ء میں شائع ہوئی تھی۔ ایک ہی موضوع پر اِن چند ممتاز مؤرخین کی کتابوں میں عزیز احمد کی کتاب تخلیقی تاریخ نویسی کے اعتبار سے بھی زیادہ قابلِ تحسین ہے اور تجزیاتی اعتبار سے بھی چند ایسے سوالات پر غور و فکر کا سامان مہیا کرتی ہے جو پہلی بار انہی کی کتاب میں سامنے آئے ہیں۔

عزیز احمد ۱۷۱۰ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک برصغیر میں مسلمانوں کی تاریخ و سیاست، ادب اور معاشرت، تصوف و حکمت کا جدید علم و حکمت کی روشنی میں جائزہ پیش کرتے وقت ہندی مسلمانوں کی انفرادیت کو اُجاگر کرتے ہیں۔ اِسی منفرد اندازِ نظر کی بدولت قاری کتاب کے آخری باب تک پہنچتا ہے تو قیامِ پاکستان کے محرکات و عوامل کو بخوبی سمجھ جاتا ہے۔ اِسی مقصد کی خاطر کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں بلادِ اسلامیہ ہند (Muslim India) اور وسیع تر دنیائے اسلام کے باہمی اٹوٹ رشتوں سے پیدا ہونے والی صورتِ حال پر بحث کی گئی ہے۔ دوسرے حصے میں بلادِ اسلامیہ ہند اور ہندو انڈیا کے مابین کشمکش، تصادم اور امن و آشتی کی فضا کو عہد بہ عہد زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ اس سلسلے میں برسرِ اقتدار مسلمانوں کی انتظامیہ میں ہندو عناصر کی احسن کارکردگی کے اسباب و نتائج سے بحث کی گئی ہے۔ اِسی ضمن میں شہنشاہ اکبر کے عہد میں رواج دی جانے والی اصلاحات کے اثرات و نتائج کا حقیقت افروز تجزیہ کرتے ہوئے داراشکوہ اور اورنگ زیب، دو بھائیوں کے درمیان نظریاتی اور سیاسی کشمکش سے بھی بھرپور انداز میں استفادہ کیا گیا ہے اور اپنی بحث کو حضرت شاہ ولی اللہ کی تحریک اصلاح کے تعارف و تجزیہ پر تمام کیا گیا ہے۔

کتاب کے انتہائی قابلِ تحسین ابواب ادب اور کلچر کی تحریکوں کے پس پردہ عوامل و محرکات کے نہایت عمدہ تجزیہ پر مشتمل ہیں۔ ان ابواب میں مسلمانوں کی جانب سے سنسکرت اور ہندی ادب کی سرپرستی اور ہندو ادیبوں اور شاعروں کی جانب سے اردو ادب سے تخلیقی شغف کی کہانی بھی بیان کی گئی ہے۔ اس ضمن میں اردو اور ہندی تنازعہ زیر بحث لایا گیا ہے۔ یہاں بھی ہندوؤں کی اردو دوستی اور مسلمانوں کی سنسکرت اور ہندی سے محبت زیرِ بحث لائی گئی ہے۔ آخری باب ''اختتامیہ'' کے عنوان سے دیا گیا ہے۔ اِس کا عنوان ''جدید علیحدگی پسندی'' (Modern Separation) ہے۔ اس باب میں ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۴۸ء تک کے حالات و واقعات سے پھوٹنے والی حکمت و دانش سے کام لیا گیا ہے۔ پوری کتاب پڑھیں یہ ایک باب پاکستان کا قیام اور تحریک پاکستان میں اقبال کے تصورِ پاکستان اور اس تصور کے قائداعظم کی قیادت میں تحریکِ پاکستان میں ڈھل جانے کی کہانی تاریخ کی ایک اٹل حقیقت نظر آتی ہے۔ عزیز احمد کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے پوری کتاب میں کہیں بھی نعرہ زنی نہیں کی۔ اُن کی کتاب پڑھنے کے بعد پاکستان کا تصور اور پاکستان کا قیام ایک سائنسی حقیقت ثابت ہو جاتا ہے۔

عزیز احمد نے کتاب کے حصہ اوّل میں ۱۷۱۰ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک اسلامی ہند کے وسیع تر دنیائے اسلام سے دینی، ملّی اور سیاسی روابط کا تاریخی تجزیہ پیش کیا ہے۔ اِس سلسلے میں انہوں نے اپنی بحث کو چار موضوعات میں یوں تقسیم کیا ہے کہ برصغیر کے مسلمانوں کی فکری اور سیاسی تاریخ ایک تسلسل میں سمٹ آئی ہے۔ شروع میں سلطنتِ دہلی کی پوری تاریخ میں آفاقی اسلامی خلافت کے نظام کا تعارف اور اس نظام کے ساتھ اسلامی ہند کے پائیدار تعلق کو واضح کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ہندوستان کی

مساجد میں نماز جمعہ کے خطبات میں خلیفہء اسلام کا نام بڑے اہتمام کے ساتھ گونجتا تھا اور یوں اسلامی ہند کے مسلمان خود کو سلطنتِ دہلی کے ساتھ ساتھ پوری دنیائے اسلام سے وابستہ سمجھتے تھے ۔ اس صورت حال میں اُن کی دینی اور روحانی زندگی مقامی اثرات کے باوجود دین اسلام کی آفاقی تعلیمات سے فیضیاب ہوتی رہتی تھی۔ وہ خود کو ایک ایسا مسلمان سمجھتے تھے جو ہندوستان میں ہے مگر ہندوستان کا نہیں بلکہ دنیائے اسلام کا فرد ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ دہلی سلطنت کے سارے دورانیہ میں سِکوں پر عباسی خلیفہ کا نقش کندہ ہوتا تھا اور بعدازاں جس طرح سے جمعہ کے خطبے میں عباسی خلیفہ کا نام گونجتا رہا۔ آخر میں خلیفہ کے نام کی بجائے خلیفہ کے عہد کا تذکرہ ہونے لگا تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ۱۹۲۴ء میں خلافت عثمانیہ کے خاتمے کے بعد صرف خلیفۃ المسلمین کا تصور باقی رہ گیا تھا اور کوئی شخص بطور خلیفہ موجود ہی نہ رہا تھا۔ یہ اِس بات کا ثبوت ہے کہ سلطنتِ دہلی کے حکمران خود کو خلافتِ اسلامیہ سے نفسیاتی طور پر منسلک دیکھنا چاہتے تھے۔

سقوطِ بغداد کے بعد وسطِ ایشیا کے اثرات اسلامی ہند پر بھی مسلسل گہرے ہوتے چلے گئے۔ بہت سے نامور علماء، فضلاء، شعراء اور صنّاع جان کی امان پانے اسلامی ہند میں آوارد ہوئے۔ محمد تغلق بصرہ و بغداد اور وسطِ ایشیا کے شہروں سے ہجرت کر کے آنے والے اہلِ علم و فضل کے بہت بڑے قدردان تھے۔ انھوں نے اِن اہلِ کمال کو سرکار دربار میں اور سلطنت کے مختلف حصوں میں بلند درجات پر فائز کر دیا۔ اس حکمت عملی کا نتیجہ یہ نکلا کہ چنگیز و ہلاکو کے ہاتھوں مسلمان سلطنت کی تباہی اور بربادی کے ساتھ ہی اسلامی ہند علم و ہُنر اور فضل و کمال کا بہت بڑا مرکز بن گیا۔ اقبال کے لفظوں میں جو اُدھر بغداد کی سلطنت میں ڈوبے تھے وہ اِدھر اسلامی ہند میں آ نکلے۔ یوں اسلامی ہند دنیائے اسلام کا نیا علمی اور تہذیبی مرکز بن کر جگمگانے لگا۔

کتاب کا اگلا باب سولہویں اور سترہویں صدی کے دوران اسلامی ہند اور وسیع تر دُنیائے اسلام کے مابین سیاسی، تہذیبی اور روحانی روابط کے تذکرے سے عبارت ہے۔ یہ گویا دورِ مغلیہ میں ہندوستان اور دُنیائے اسلام کے تذکرے پر مشتمل ہے۔ مُغل بادشاہوں کے ترکی میں سلطنتِ عثمانیہ، ایران اور وسط ایشیا سے تعلقات کے نشیب و فراز کی کہانی ہے۔ یہاں اکبر اور اُس کے شیخ الاسلام مخدوم الملک کی جانب سے مختلف اور متنوع اصلاحی کوششوں کا سرسری سا ذکر ہے۔ دینِ الٰہی کی بحث کو اس باب میں چھیڑا ہی نہیں گیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ دینِ الٰہی کا آغاز اور انجام صرف مُغل ہندوستان تک محدود رہا اور وسیع تر دنیائے میں اس کی شدید متنازعہ حیثیت کو پہنچنے ہی نہیں دیا گیا۔ جب وسط ایشیا سے یہ وضاحت طلب کی گئی کہ کیا آپ نے اسلام ترک کر دیا ہے تو اکبر نے فی الفور خطرے کو بھانپ لیا اور جواب میں یہ لکھا کہ میں نے اسلام ہرگز ترک نہیں کیا۔ میں اسلام کا پابند ہوں۔ صرف ملائیت کے ترجمان میرے خلاف جھوٹا پراپیگنڈہ کر رہے ہیں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اکبر کے نورتنوں اور نامور ترین عمائدین نے دین کی اس تشریح کو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ جب اکبر نے اپنی حکومت کے ارکان کے سامنے دین الٰہی کا تصور پیش کیا تھا تو سب سے پہلے اُس کی افواج کے کمانڈر اور وزیرِ دفاع مان سنگھ نے اس نئے دین کو ماننے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ ہندوستان میں دو مذہب ہیں ایک ہندومت اور دوسرا اسلام۔ میں ہندو ہوں اگر شہنشاہِ اکبر مجھ سے یہ تقاضا کریں کہ میں ہندومت چھوڑ کر اسلام قبول کر لوں تو میں ایسا کر لوں گا کیونکہ اسلام بھی ایک مذہب ہے لیکن یہ دین الٰہی کوئی مذہب نہیں۔

اس باب میں اورنگ زیب کے دورِ آخر اور اورنگ زیب کے نااہل جانشینوں تک کی سیاسی دفاعی اور خارجی معاملات و مسائل کی بحث پر اکتفا کیا گیا ہے۔ باب کے آخری حصے میں گجرات اور دکن کی ریاستوں کے مسائل و معاملات کا تذکرہ موجود ہے۔ اِن دو ریاستوں کے احوال و مقامات پر یورپ کی ابھرتی ہوئی طاقتوں کے اثرات کو بھی نمایاں کیا گیا ہے۔ گجرات پر ممکنہ پرتگیزی حملوں کے خطرات کا تذکرہ کیا گیا ہے اور دکن میں ٹیپو سلطان کی جانب سے انگریزوں کے بڑھتے

ہوئے اثر و رسوخ کو ختم کرنے کی خاطر ترکی کی عثمانی خلافت سے راہ و رسم بڑھانے کے عزائم بھی زیرِ بحث آئے۔ یوں اس باب کے آخر تک پہنچتے پہنچتے برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کے سیاسی عزائم سے ٹیپو سلطان کے باخبری اور سیاسی اور دفاعی تدابیر کی جانب قارئین کی توجہ دلائی گئی ہے۔

اگلے باب میں پان اسلام ازم اور اسلامی جدیدیت کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ یہاں دو شخصیات کے فکر و عمل کا تقابلی جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ دو شخصیات سرسید احمد خان اور سید جمال الدین افغانی ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں مسلمانوں کی فیصلہ کن شکست کے بعد سرسید احمد خان نے ہندی مسلمانوں کی علمی پسماندگی اور دورِ حاضر کے سائنسی علوم سے ناشناسی کو مسلمانوں کی شکست کا اصل سبب قرار دیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی علمی اور معاشرتی اصلاح کی تحریک کے ذریعے مسلمانوں کو قرونِ وسطیٰ سے نکال کر عہدِ جدید میں لانے کی مساعی کا آغاز کر دیا تھا۔ وہ بڑے انہماک اور یکسوئی کے ساتھ ہندی مسلمانوں کو اصلاح کے راستے پر گامزن دیکھنا چاہتے تھے۔ تعلیم کے ذریعے مسلمانوں کو پستی سے اُٹھا کر عروج پر لانے کی خاطر انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی قائم کی، مذہب اور سائنس میں موافقت پیدا کرنے کی خاطر رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا اور ''جدید علم الکلام'' کی بنیاد رکھی۔ انھوں نے شعوری کوشش کی کہ قرآنی تعلیمات کو سائنس کی رُو سے سچا ثابت کر کے مسلمانوں کو سائنسی نظریات کے برحق ہونے کا یقین دلایا جائے۔اس ضمن میں اُن کی کوشش یہی رہی کہ ہندی مسلمان سیاست سے دُور رہ کر اپنی علمی اور سائنسی پسماندگی کو علم دوستی اور روشن خیالی میں بدل ڈالیں۔ وہ ہندوستان کے اندر ہی نہیں بلکہ ہندوستان سے باہر وسیع تر اسلامی دنیا کی سیاست سے ہندی مسلمانوں کو الگ تھلگ رکھنا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندی مسلمان پہلے اپنے تاریک دور سے سائنسی روشنیوں میں آ نکلیں اور پھر زمانہء حاضر کی ضرورتوں کو پورا کر کے دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کی صف میں جگہ بنا لیں۔ سید جمال الدین افغانی پہلے دنیائے اسلام کو مغرب کے غلبے سے نجات دلانا چاہتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ایک دفعہ دنیائے اسلام سامراجی غلامی سے آزاد ہو جائیں پھر اُس پر ترقی کھلتی چلی جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کا زور بین الاسلامیت (پان اسلام ازم) پر رہا جبکہ سرسید احمد خان کی تمام تر مساعی جدیدیت پر مرکوز رہی۔ وہ سمجھتے تھے کہ مسلمان جدیدیت کو اپنا لینے کے بعد باقی تمام سیاسی اور تہذیبی مصائب سے نجات پا لیں گے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ سید جمال الدین افغانی نے جدید علم الکلام کی تلاش و جستجو نہیں کی اور صرف سامراج سے آزادی کو اپنی تمام جدوجہد کا مرکزی حوالہ قرار دے دیا تھا۔

سید جمال الدین افغانی اور سرسید احمد خان کے درمیان نقطہ ہائے اشتراک و اختلاف کی تلاش و جستجو کا حاصل یہ ہے کہ ہر دو مصلحین مسلمان معاشروں کو عہدِ جدید کی روشنیوں میں لانا اور مروجہ نئے علوم سے مستفیض کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ اِس اشتراک کے باوجود سید جمال الدین افغانی اس امر کو کبھی بھی فراموش نہ کر سکے کہ سرسید احمد خان کی فکر و نظر کا محور صرف ہندی مسلمان ہیں۔ وہ انہیں خوابِ غفلت سے جگانا اور نئے زمانے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر زندہ رہنے کی ترغیب میں مصروف ہیں۔ سرسید اس باب میں یہ سمجھتے تھے کہ فی الحال ہندی مسلمانوں کو باہر کی دنیائے اسلام کی بجائے صرف اپنی حالت بدلنے کا نصب العین اپنانا چاہیے۔ یہ وہی سرسید احمد خان ہیں جو خلافت عثمانیہ کے دور میں عثمانی خلافت کے سرگرم حامی تھے مگر ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں عبرتناک شکست کے بعد انھوں نے وقتی طور پر اپنے فکر و عمل کو ہندی مسلمانوں تک محدود کر دیا تھا۔ تاہم یہ حقیقت جمال الدین افغانی کے سرسید کے ساتھ تمام تر اختلافات کا سبب بن کر رہ گئی تھی۔۱۹ویں صدی کے نصف آخر میں جمال الدین افغانی کے تصورات نے ہندی مسلمانوں کو بھی اپنے سحر کا اسیر کر لیا تھا۔ جمال الدین افغانی کی زیرِ ادارت پیرس سے شائع ہونے والا ''العروۃ الوثقیٰ'' نہ صرف یہ کہ ہندوستان میں مقبول ہو رہا تھا بلکہ اُس میں شائع ہونے والے مضامین کا

ترجمہ بھی تسلسل اور تواتر کے ساتھ رسالہ ''دارالسلطنت'' (کلکتہ) اور ''مشیر قیصر'' لکھنؤ کے جرائد میں شائع ہونے لگا تھا۔ افغانی کے بین الاسلامی موضوعات پر خیالات سرسید احمد خان کے نسبتاً نوجوان رفقاء مثلاً شبلی نعمانی تک کو اپنے حلقہء اثر میں لینے لگے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا شبلی نعمانی کسی یورپی ملک کی بجائے مصر و شام کے دانشوروں سے ملنے مصر، شام و روم کے چکر لگاتے رہے اور جمال الدین افغانی کے زیرِ اثر ان ممالک میں مفتی محمد عبدہ، اور اُن کے دائرہ اثر کے تحت رشید رضا جیسے جدیدیت پسند دانشوروں سے راہ و رسم بڑھاتے رہے۔ نتیجتاً مولانا شبلی سرسید کے علی گڑھ سے اُٹھ کر اعظم گڑھ جا بیٹھے۔ وہاں دارالمصنفین قائم کیا اور جدیدیت میں سامراج دشمنی کو ممیّز کر کے ایک نئی تحریک کی بنیاد رکھنے میں مصروف ہو گئے۔

مولانا ابوالکلام آزاد اور علامہ اقبال کی فکر پر بھی جمال الدین افغانی نے گہرے اور مثبت اثرات مرتب کیے۔ عزیز احمد نے لکھا ہے کہ ''العروۃ الوثقیٰ'' کے ذریعے قبول عام بنائے گئے افغانی کے تصورات سے ہندوستان میں تحریکِ خلافت کے رہنماؤں نے گہرے اثرات قبول کیے۔ اس اعتبار سے دیکھیں تو ہندوستان کی خلافت تحریک جمال الدین افغانی کے عالمی اسلامی اتحاد سے متاثر نوجوان رہنماؤں کا کرشمہ تھی۔

علامہ جمال الدین افغانی دُنیائے اسلام کے اتحاد کی خاطر ساری دنیا کے مسلمانوں کا ایک سیاسی مرکز ضرور سمجھتے تھے۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر انہوں نے ترکی کی عثمانی سلطنت کو مرکز بنانے کی مساعی کی۔ ہندوستانی مسلمان سلطنتِ عثمانیہ کے خاتمے تک اپنے خطباتِ جمعہ میں ترکی سلطان ہی کا نام پکارتے رہے۔ خلافت کے خاتمے کے بعد دنیائے اسلام کی آزادی اور وحدت کا یہ خواب بکھر کر رہ گیا اور مصطفیٰ کمال اتاترک نے ترکی میں ایک جدید ترک قوم کی جدید حکومت کے تصور کو زندہ کر کے دنیائے اسلام کی وحدت کو مختلف آزاد اور خودمختار مسلمان ملکوں کے وفاق کی شکل میں پیش کیا۔ خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے اور جدید ترکی قومی ریاست کے قیام کے بعد ہندوستان میں مولانا ابوالکلام آزاد کے عالمی خلافت کے علمبرداروں کے خواب منتشر ہو کر رہ گئے اور رفتہ رفتہ علامہ اقبال اور قائداعظم کی جدید قومی ریاست کے خواب قبول عام حاصل کر گئے۔ یاد رہے کہ علامہ اقبال اور قائداعظم ہر دو بانیانِ پاکستان مصطفیٰ کمال اتاترک کے حامی تھے۔ قائداعظم کی پسندیدہ کتاب مصطفیٰ کمال اتاترک کی سوانح بعنوان "The Grey Wolf" تھی اور اقبال نے اپنی انگریزی نثر اور فارسی شاعری میں اتاترک کو خراجِ تحسین پیش کیا اور بطورِ خاص اُس کی ملائیت سے نفرت کو سراسر جائز ٹھہرایا ہے۔

عزیز احمد نے مولانا ابوالکلام آزاد کے تصور خلافت کو زیرِ بحث لاتے ہوئے بتایا ہے کہ خلافتِ ملوکی سے وفاداری ہر مسلمان پر فرض ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ اور بادشاہِ وقت کی وفاداری مسلمانوں کے لیے فرض عین ہے۔ صرف اُسی صورت میں خلیفہء وقت کی نافرمانی کی جاسکتی ہے جب وہ قرآن وسنت کے احکامات سے رُوگردانی کرے۔ عزیز احمد کے خیال میں ابوالکلام کا یہ تصور اسلامیانِ ہند کی اجتماعی رائے (اجماع) کے برعکس ہے۔ یہاں غالباً عزیز احمد کا اشارہ ہندوستانی مسلمانوں کی بھارتی اکثریت کی جانب سے علامہ اقبال کے تصورِ پاکستان اور قائداعظم کی تحریکِ پاکستان کی تائید وحمایت کی جانب ہے۔

زیرِ نظر باب کا چوتھا اور آخری حصہ اقبال کے انقلابی اسلامی تصورات کے تجزیہ و تعارف پر مشتمل ہے۔ عزیز احمد کے لفظوں میں:

> **"The intellectual leadership of Muslim India passed to Muhammad Iqbal in the 1920s. His political philosophy was also based on the two essential elements of Islam: The Unity of God and Prophethood of Muhammad (PBUH)."(4)**

علامہ اقبال نے ۲۰ویں صدی کی دوسری دہائی میں اپنے خطبات میں اسلام میں دینی فکر کی نئی تشکیل کے موضوع پر

جوخیالات پیش کیے تھے عزیز احمد نے یہاں اپنی بحث کو انہی خطبات کے جدید افکار وتصورات کے اثبات میں اپنے دلائل پیش کیے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ اقبال کے نزدیک آنحضورﷺ کا پیغام الہامی تھا مگر اس الہامِ خداوندی کی رُوح سراسر عقلی اور استدلالی ہے۔ چنانچہ اسلام باطنی تجربات کو انسانی علم کا سرچشمہ قرار دیتے وقت اس کی رُوح کو عقلی اور حرکی قرار دیتا ہے۔ اقبال کے مطابق ہماری یہ کائنات بھی حرکت وعمل سے لبریز ہے۔ اسلامی کلچر عقیدہء توحید پر اللہ تعالیٰ کی وحدت کے ساتھ ساتھ وحدتِ آدم کو انسانیت کی جذباتی اور عملی زندگی میں توحید کے تصور کو سرچشمہ فیضان قرار دیتا ہے۔ اقبال نے اپنی اس تفسیر کی رُو سے سوسائٹی کے ارتقاء کو اجتہاد کے اصول پر ایک بالکل نئے استدلال کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اقبال کی نظر میں اسلامی قوانین بنیادی طور پر ارتقائی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لیے ان قوانین کو زندگی کی جدید ضروریات کے مطابق اسلام کی حقیقی رُوح کی روشنی میں بتدریج نئے سرے سے تفسیر کیا جا سکتا ہے اور زندگی کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق ان کی نئی تعبیر ہوتی رہنی چاہیے۔ اپنے چھٹے خطبے بعنوان ''اسلام میں اصولِ حرکت'' میں اقبال نے اجتہاد کے اصولوں میں اجماع کے اصول کی بالکل نئی تعبیر کی ہے۔ عزیز احمد نے اپنی بحث میں اقبال کے اِس اجتہاد پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے اپنے زمانے کی ترکی اسمبلی میں وقتاً فوقتاً اس موضوع پر ہونے والے مباحث سے خوب استفادہ کیا ہے اور ترکی کی گرینڈ نیشنل اسمبلی میں پیش کیے گئے جدید تصورات کا حوالہ دیا ہے اور اجتہاد کے مروّجہ چار اصولوں میں سے آخری اصول یعنی اجماع کا فریضہ چند مجتہدین کو سونپنے کی بجائے قومی اسمبلی کو سونپ دیا ہے۔ یہ ایک ایسا انقلابی تصور ہے جس کی اقبال نے وکالت کرتے ہوئے یہ تک کہہ دیا ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ اور عام سا عام مسلمان بھی اسلام کا جبلّی شعور رکھتا ہے۔ عام آدمی کے اس شعور سے قومی اسمبلی اجتہاد کرتے وقت بیش از بیش استفادہ کرسکتی ہے۔

عزیز احمد نے اقبال کے اِس اجتہاد کو اقبال کے تصورِ پاکستان سے جوڑتے ہوئے اپنی یہ بحث ختم کی ہے۔ اُن کے خیال میں اقبال نے اپنے اِس اجتہاد کی رُو سے برصغیر میں مسلم قومیت کی بنیاد پر ایک جداگانہ اور خودمختار مسلمان مملکت کا تصور اسی بیسویں صدی کی دوسری دہائی کے آخری سال ۱۹۳۰ء میں اپنے خطبہء الہ آباد میں پیش کر دیا تھا۔

کتاب کے دوسرے حصے میں مسلم انڈیا اور ہندو انڈیا کے باہمی روابط کو موضوع بنایا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں ہندوستان میں مسلمانوں کی لہر در لہر آمد کا تعارف اور تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ تیسرے حصے میں مسلمانوں کے قائم کردہ اداروں کے ہندوستانی معاشرت پر اثرات کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ چوتھے حصے میں ہندومت سے قبولِ اسلام کے اثرات ونتائج زیر بحث آئے ہیں۔ آگے چل کر رواداری اور عدم رواداری کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کی طرف قبولِ اسلام کی مخالفت اور اُس کے اثرات زیرِ بحث لائے گئے ہیں۔

عزیز احمد نے انگریز اور دیگر غیر مسلم مورخین کے اس عمومی تصور سے اختلاف کیا ہے کہ ۱۲ صدیوں تک ہندو اور مسلمان باہمی کشمکش اور اضطراب کا شکار رہے ہیں۔ اُن کا کہنا یہ ہے کہ اس طرح کے تصورات زیادہ سے زیادہ کم بیانی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اُن کی نظر میں قدیم اور جدید ہندوستان کی طویل تاریخ کے دوران ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین مذہبی اور تہذیبی اختلافات سے پیدا ہونے والی تشویش ناک صورتِ حال موجود رہی ہے۔ ہندو مسلم اتحاد میں کوشاں قوتیں اپنے نتائج کے اعتبار سے کمزور رہی ہیں اور علیحدگی کی قوتیں ہمیشہ طاقتور رہی ہیں۔ اپنے اس استدلال کی حمایت میں عزیز احمد نے جرمن مفکر سپنگلر (Spengler) اور آرنلڈ ٹائن بی (Arnold Toyenbe) کی کتابوں سے اقتباسات بھی پیش کیے ہیں۔

عزیز احمد نے مغرب کی مختلف زبانوں کے برصغیر شناس مفکرین کی تحقیق سے استفادہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اسلام یہودیت اور عیسائیت کے مابین اُمہ کا تصور مشترک ہے۔ اِس کے برعکس بدھ مت اور ہندومت کے درمیان ایسا نہیں ہے۔

ہندومت میں تو اُونچ نیچ اور ذات پات کا برہمنی تصور ہمیشہ سے موجود رہا ہے۔ اس لیے انسانوں کے مابین وحدت ناممکن چلی آ رہی ہے۔ جب خود ہندوؤں میں حقیقی وحدت اور انسانی مساوات سرے سے موجود ہی نہیں تو وہ دیگر ادیان کے ماننے والوں کے ساتھ اخوت و مساوات کا تصور اپنا ہی نہیں سکتے۔اپنے اپنے مذہبی تصورات پر قائم رہنے کے باعث ہندو مسلم یگانگت کا تصور ناممکن رہا۔ عزیز احمد نے تارا چند کے اس بیان کو تجزیاتی نظر سے دیکھا ہے کہ ''مسلمان ہندوستان میں ہیں مگر ہندوستان کے نہیں ہیں'' ۔ عزیز احمد نے اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے اسلامیانِ ہند کے وسیع تر اسلامی دنیا کے ساتھ گہرے اور اٹوٹ رشتوں پر روشنی ڈالی ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ مسلمان ہندوستان میں مشرق وسطیٰ سے آئے ہوں، ترکی سے آئے ہوں یا ایران اور وسطِ ایشیا سے آئے ہوں، یہ سب لوگ ہندوستان میں رہتے ہوئے بھی دنیائے اسلام سے اٹوٹ دینی اور روحانی رشتوں میں منسلک رہے۔ صدیوں ہندوستان میں ہندوؤں کے ساتھ رہنے کے باوجود یہ لوگ عملاً ایک نہ ہو سکے۔ اس کی بڑی وجہ توحید پرستی اور بت پرستی کے درمیان گہرے اختلافات ہیں۔ ہندومت ایک بہت ہی قدیم اور ہر زمانے میں بدلتا ہوا مشرک عقیدہ ہے۔ اس کے برعکس مسلمان دین موسیٰ و ابراہیم کے تسلسل میں ایک خدا کی پیدا کردہ مخلوق سے عقیدۂ ہم رشتہ چلے آئے ہیں۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے اقبال کی طویل نظم 'شکوہ' ہمارے لیے آسانیاں پیدا کر سکتی ہے:

خُوگرِ پیکرِ محسوس تھی انساں کی نظر
مان لیتا کوئی ان دیکھے خدا کو کیونکر؟

یہاں اقبال نے ہندومت کی قدامت کی جانب تاریخ کے حوالے سے بات کی ہے۔ اُن کے خیال میں چونکہ ہندومت بہت ہی پُرانا مذہب ہے اس لیے جب یہ مذہب دُنیا میں آیا اُس وقت انسان اپنے بچپنے میں تھا۔ وہ بتوں کی موجودگی کو تو محسوس کر سکتا تھا، آنکھ سے دیکھ سکتا تھا، ہاتھ سے چُھو سکتا تھا لیکن نظروں سے غائب اور دل و دماغ میں حاضر خدا کا تصور کرنے سے قاصر تھا۔ بالکل اسی استدلال کو اقبال نے ''آنحضورﷺ کی خدمت میں'' اپنی ایک عرضداشت پیش کرنے سے پہلے نعتیہ انداز میں پیش کیا ہے:

نے خداہا ساختند از گاؤخر
نے حضورِ کاہناں افگندہ سر
نے سجودِ پیشِ مسجودانِ پیر
نے طوافِ کوشکِ سلطان و میر

عزیز احمد نے برصغیر میں مسلمانوں کی آمد کو تین مختلف لہروں سے تعبیر کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ پہلے پہل مسلمان تاجروں اور مُبلّغین کی صورت میں ہندوستان کے شمالی ساحلی علاقوں میں وارد ہوئے تھے۔ صدیوں بعد آمدِ اسلام کی دوسری لہر بُو اُمیہ کی فتحِ سندھ کی صورت میں نمودار ہوئی اور آخر آخر زیادہ منظم صورت میں وسطِ ایشیائی ترکوں اور افغانوں پر مشتمل تیسری لہر نمودار ہوئی۔

عرب مسلمان قبل از اسلام کے عربوں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ہندوستان کے شمالی ساحلوں پر تجارت اور تبلیغ کی غرض سے ایک تسلسل اور تواتر کے ساتھ آباد ہوتے چلے گئے۔ عزیز احمد کے مطابق اِن عرب تاجروں کو یہاں کے ہندو حکمرانوں نے بڑی رواداری کے ساتھ قبول کیا۔ ان میں سے بعض ہندو راجاؤں کی رضا کارانہ طور پر قبولِ اسلام کی کہانیاں بھی یہاں زبانی زدِ عام ہیں۔ ہندو راجاؤں نے بڑی فراخدلی کے ساتھ ان مسلمان تاجروں اور مبلغین اسلام کو تبلیغ کی سہولتیں فراہم کیں:

"Muslim Arabs arrived on India's coast in the wake of their

pagan ancestors who had carried on a tradition of maritime trade across the Arabian sea since nearly the dawn of history. These Arab traders who settled down on India's coasts between the seventh and ninth century were treated with tolerance by Hindu rulers, and the legend of conversion of a Cheraman Perumal raja shows that they were allowed to propagate Islam. They intermarried with indigenous women; some of them joined service under Hindu princes; and at least one of them contributed financially to a Hindu temple. Several Muslim communities like the Labbes, the Mapillas (Moplahs) and the Nawait thrived in the south and their descendants still survive."(5)

اِس کے برعکس محمد بن قاسم کی فتح سندھ کے بعد جب یہ علاقہ اسلامی خلافت کا ایک صوبہ بنا دیا گیا تب ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ایک بالکل مختلف قسم کی صورت حال پیدا ہوگئی۔ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے اپنی متذکرہ بالا کتاب کے پہلے دو ابواب Islam enters Sub-continent اور Islam gains a foot hold in the North West میں بڑی دقتِ نظر اور دیدہ ریزی کے ساتھ اسلام میں انسانی اخوت و مساوات کے تصورات کے ہندوؤں کے ذات پات اور چھوت چھات پر مبنی معاشرتی طبقات پر مثبت اثرات کی مثالیں پیش کی ہیں۔ اُنھوں نے بتایا ہے کہ کس طرح وادیء سندھ کی اکثریت بدھ مت کے پیروکاروں پر مشتمل تھی جنھیں ہندو راجاؤں نے زبردستی نچلی ذاتوں کے ہندو بنا رکھا تھا۔ پہلے پہل جب خراسان میں بدھ مت کے جلاوطن بھکشوؤں اور مسلمان صوفیا کے درمیان علمی اور فکری تبادلہء خیال ہوا تب یہ کھلا کہ بدھ مت کے اخوت و مساوات کے تصورات اسلام کے انسانی حریت و مساوات کے تصورات سے مماثل ہیں۔ چنانچہ وادیء سندھ میں مسلمانوں کے یہ تصورات اندر اندر پھیلنے لگے۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے مستند تاریخی حوالوں سے اِس حقیقت کا اثبات کیا ہے کہ محمد بن قاسم کی فتح سندھ میں سندھ کی اِن سابق بُدھ باشندوں کی دُعائیں اور دوائیں ہر دو شامل تھیں۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے اِس امر کا حوالہ بھی دیا ہے کہ محمد بن قاسم کی فوج نے جن کشتیوں پر دریائے سندھ عبور کیا تھا وہ مقامی بدھ مت کے ہم نوا لوگوں نے مہیا کی تھیں:

"There are several instances of Buddhist collusion with the invaders. For instance, it was a priest who came and told Muhammad bin Qasim to aim at the flag and the pinnacle of the temple in Debal. It was another priest who acted as the messenger between the Arab prisoners in Debal and the Arab general. It is not impossible that the prophecy regarding the fall of Debal if the flag of the temple could be demolished was fabricated for the benefit of the Muslims. Nirun, which was under a Buddhist chief, had been in correspondence with the Arabs even before Muhammad bin Qasim set foot on the soil of Sind. It made a show of resistance because the chief was away with Dahir, the king of Sind, when the Arabs appeared before its gates, but as soon as the chief came back, he apologised and surrendered the town. Siwastan, the are around modern Sehwan and Sibi, was under

Bajhra, a first cousin of the ruler. The Buddhists advised him not to fight because "they could intercede for him" with the Arabs "who never broke their promises". When Bajhra turned this suggestion down, they made it amply clear that they did not want to embroil themselves in fighting. Bajhra soon despaired of putting up resistance and the Arabs gained the fort with the cooperation of the Buddhist population. Similarly Kaka Kotak, a Buddhist chief of the area near Sehwan, advised his followers and Jats not to fight against the Muslims, because Buddhist priests had told him the the area was destined to fall into the hands of the Muslims. He not only tendered this advice to those who had intended hostilities against the Arabs, but went to the Arab camp and agave them valuable information."(6)

اپنی کتاب کے اسی حصے میں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے وادیء کشمیر میں اسلام کے پُرامن پھیلاؤ کی تاریخی شہادتیں پیش کرتے ہوئے اسلام کی اِن علاقوں میں مروجہ مذاہب پر فضیلت کے ثبوت پیش کیے ہیں- یہ بات زبان زدِ عام ہے کہ وادیء کشمیر کے بُدھ حکمران نے اپنے روحانی تجسس کی تسکین کی خاطر مختلف مروجہ مذاہب کا تفصیلی مطالعہ کیا تھا اور اِس موضوع پر متعدد مناظرے بھی منعقد کیے تھے اور یُوں بالآخر اسلام کی حقانیت پر ایمان لے آیا تھا- بعد ازاں سید علی ہمدانی اور اُس کے مریدوں کے فکر و عمل نے کشمیر کی کثیر آبادی کو حلقہء اسلام میں آ داخل کیا تھا-ایس ایم اکرام نے اپنی کتاب **Muslim Civilization in India** میں اسی موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"The largest Arab coastal settlements, however, were in Malabar, where Muslims now form a substantial part of the population. One result of the Arab settlement was the conversion of a local ruler to Islam, an event which undoubtedly helped the position of the Muslim community. Another influence of the arrival of Muslims may possibly be seen in the great religious movements in South India in the ninth century. It has been suggested, although without very clear proof, that the religious ferment of the period may have owed something to Muslim ideas".(7)

ڈاکٹر تارا چند نے بھی اپنی کتاب کے پہلے باب میں مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد کی مختلف جزئیات اور تفصیلات کو اس حقیقت کے اظہار پر تمام کیا ہے کہ محمود غزنوی کی فتح سندھ کے ساتھ ہی مسلمان صوفیا عظام اور علمائے کرام کا ہندوستان میں ایک سیلابِ مسلسل شروع ہو گیا تھا جن کے فیضان نے عوام میں اسلام کے فیوض و برکات کو عام کرنے میں عہد آفریں کارنامہ سرانجام دیا تھا-

After the invasions of Mahmud, numerous Muslim men of learning and religion poured into India. It is impossible to compile a list of all of them, but some of the important ones may be mentioned here. Among them was 'Ali bin usman Al Hujwiri the author of Kashful Mahjub who was a native of Ghazna, and who after travelling extensive over Muslim land came to reside in

Lahore where he died in 465 or 469 A.H...(8)

یُوں محسوس ہوتا ہے جیسے برہمنیت کے شکار بُدھ عوام کی مانند ہندوستان کے عوام آمدِ اسلام کے منتظر تھے۔ جیلانی کامران نے اپنے ایک طویل مقالہ بعنوان ''آمدِ اسلام کے ادبی مکاشفے'' (۹)میں اُن خوابوں اور خیالوں پر مشتمل مکاشفوں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے جو ہندوستان میں طلوعِ اسلام سے ذرا پہلے دیکھے اور لکھے جا رہے تھے۔ چند صدی بعد جب پورا برصغیر مسلمانوں کے زیرِ نگیں آ گیا تو حاکم ومحکوم کے تعلق نے ہندو مسلمان تعلقات میں پیچیدگیاں پیدا کر دیں۔ عزیز احمد کا کہنا ہے کہ بعد کی پے در پے ترک افغان فتوحات قبل ازیں سندھ میں عرب توسیع پسندی سے مختلف ہیں۔ وسطِ ایشیائی طاقتوں نے اپنے پے در پے حملوں کے بعد سارے ہندوستان کو اپنے اندر جذب کر کے سنٹرل ایشیا تک ساری کی ساری آبادی کو تہذیبی طور پر ہندوستان کا حصہ بنا لیا۔ یوں ہندوستان میں مسلمانوں کی حکمرانی کے آغاز اور استحکام کے دوران ہندوستان ایک کثرت پسند (Pluralistic) معاشرہ وجود میں آ گیا۔ ہر چند ہندو اور مسلمان معاشرت ایک دوسرے سے الگ الگ پروان چڑھتی رہیں تاہم مسلمان حکمرانوں کے دور میں ہندو معاشرت کو تمام تر ضروری تحفظات حاصل رہے۔

ہندوستان کی معاشرت اور سیاست پر مسلمانوں کے قائم کردہ اداروں اور دینی اعتقادات کے اثر کی نشاندہی کی خاطر عزیز احمد نے ہندوستان میں مسلمانوں کے اداروں کے قیام کے اثرات سے اپنی بحث کو مجموعی طور تصادم اور تعاون کے دو الگ الگ عنوانات کے تحت بیان کیا ہے۔ جہاں تک تصادم کا تعلق ہے قدرتی طور پر ہندوستان پر مسلمانوں کے پے در پے حملوں کے اثرات و نتائج زیرِ بحث آئے۔ سب سے پہلے غزنوی عہد سے لے کر وسطِ ایشیا اور ایران اور ترکی سے مختلف زمانوں میں آنے والے حملہ آوروں نے اسلام میں جہاد کے تصور کو اپنے سیاسی مقاصد کے لیے مسلسل اور متواتر مسخ کرنے کا عمل جاری رکھا۔ اس سلسلے کی ابتدا بنو اُمیہ کے دور میں ہوئی لیکن محمود غزنوی کے حملے میں اسے بہت شدت کے ساتھ روا رکھا گیا۔ عزیز احمد نے سومنات پر حملے کو اس کی بڑی مثال قرار دیا ہے کیونکہ اسلام میں دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کا احترام واجب ٹھہرایا گیا ہے:

> **But the interpretation of the theologians suited the Turco-Afghan invaders. This was a position not very different from that of the more or less contemporary Christian world during the Crusades.(10)**

عزیز احمد نے دوسرا بڑا اقدام جزیہ کو ٹھہرایا۔ اُن کے خیال میں مسلمان فاتحین نے اپنی سلطنت کی غیر مسلم آبادی پر جزیہ کے نام سے اضافی ٹیکس عائد کر رکھا تھا جس سے بقول عزیز احمد ہندوؤں کے دل میں نفرت نے جنم لیا۔ عزیز احمد نے چند ہندو حکمرانوں کا یہ دلچسپ ردِعمل بھی بیان کیا ہے کہ انھوں نے مسلمانوں پہ اسی نوعیت کا ایک اضافی ٹیکس عائد کر دیا تھا۔ اِسے مرہٹہ حکمران ''چوتھ'' سے تعبیر کرتے تھے۔

اس باب میں عزیز احمد نے تبدیلیء مذہب ، بت شکنی اور متعصّبانہ اقدامات کے خلاف ہندو مزاحمت کا تذکرہ کرتے ہوئے ہندوؤں کی جانب سے تنگ نظری کی مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ اس باب میں عزیز احمد نے برہمنیت کے طبقاتی تصورات کے زیرِ اثر مسلمانوں کو ملیچھ (ناپاک) قرار دے کر طبقاتی طور پر شودر سے بھی نیچے سب سے نچلا درجہ دے دیا تھا۔ اس تصور کی رُو سے ہندو اور مسلمانوں کا کھانا پینا اور رہنا سہنا الگ الگ ہو گیا تھا اور یوں رفتہ رفتہ سیاسی طور پر بھی ہندو مسلم دو الگ الگ قومیں وجود میں آ گئی تھیں:

> **"Below the surface of the easy Muslim conquest of the greater part of the sub-continent and centuries of Muslim rule there also**

developed a turbulent challenge of stiff and continued Hindu armed resistance."(11)

اس باب کے اختتامی حصے میں ہندوؤں کی مسلمانوں سے علیحدگی پسندی کے مختصر بیان کو البیرونی کی کتاب الہند کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے۔ البیرونی اُس زمانے کا مؤرخ ہے جب مسلمان پہلے پہل وادیء سندھ میں قدم جما کر آگے بڑھنے لگے تھے۔ اُس نے ہندوؤں کی مقدس کتابوں کے گہرے تجزیاتی مطالعے کے ساتھ ساتھ ہندو معاشرت کا بذاتِ خود تجربہ اور مشاہدہ کر کے معاشرتی سطح پر ہندوؤں کی ذات پات اور چھوت چھات کے اثرات پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ اُس نے یہاں تک لکھا ہے کہ ہندو غیروں کو اپنے مذہبی معتقدات سے متعارف کرنے سے بھی انکاری ہے۔ عزیز احمد نے لکھا ہے کہ پانچ سو سال بعد ابوالفضل کو بھی یہی تجربہ ہوا اور وہ بھی گلہ مند ہی رہا کہ ہندو اپنے مذہبی عقیدوں کو زیرِ بحث لانے اور اپنے مذہبی تصورات کو چھپانے میں منہمک رہتے ہیں۔ آخر میں انھوں نے Majumdar کے اس بیان کو اپنا رہبر بنایا ہے کہ ہندو اپنے غیر ملکی ہمسایوں سے اپنے مذہبی معتقدات اس لیے چھپاتے ہیں کہ وہ انھیں اچھوت اور ناپاک سمجھتے ہیں۔ شروع سے لے کر آخر تک ہندو اسلام کو اپنے لیے خطرہ تصور کرتے ہوئے ذہنی اور قلبی طور پر مسلمانوں سے دُور ہی رہے۔

اس باب کا دوسرا حصہ اِس بیان پر مشتمل ہے کہ کائستھ، کھتری اور کشمیری پنڈت کی سی ذاتوں نے مسلمانوں کے کلچر کے زیرِ اثر مسلمانوں کے زبان و ادب کو بھی اپنایا اور مسلمانوں کی انتظامی شعبوں میں بھرپور مقبولیت اختیار کر کے مسلمانوں کے طرزِ حیات کو اپنا کر ہندوستان کے تہذیبی ارتقاء کے عمل میں گرانقدر خدمات انجام دیں۔ اس کی مثال ہندوؤں کی اِن ذاتوں کے افراد نے حضرت امام حسین کے مرثیے لکھے اور عشرہ محرم الحرام میں بڑے ادب و احترام کے ساتھ پڑھے۔ اِن میں سے بعض افراد نے فیروز چند، محبوب کرن اور جواہر لال کے سے نام اختیار کر کے اپنے آپ کو بالواسطہ طور پر آدھا مسلمان بنا لیا۔ کشمیر میں سلطان زین العابدین کے دورِ حکومت میں کشمیری پنڈتوں میں سے سپرو خاندان کے لوگوں نے بطورِ خاص مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کو اپنا لیا تھا۔ ان میں سے سرٹیج بہادر سپرو بہت مشہور شخصیت تھے۔ عزیز احمد نے انڈین نیشنل کانگریس کے سرکردہ رہنماؤں میں پنڈت موتی لال نہرو اور پنڈت جواہر لال نہرو کو اِس مخلوط ہندو مسلم کلچر کے نمائندے قرار دیا ہے۔ اُنھوں نے ایک لبرل کشمیری پنڈت صحافی اور سیاستدان پریم ناتھ بزاز کا ذکر بطورِ خاص کیا ہے جنھوں نے بھارت میں رہتے ہوئے تنازعہ کشمیر میں پاکستان کے حق بجانب ہونے کی مسلسل وکالت کی تھی۔ اپنے اس تجزیے کا اختتام وہ پارسی برادری کے تذکرے پر ختم کرتے ہیں جنھوں نے پہلے مسلمان شناخت اختیار کی اور پھر جب ہندوستان سلطنت برطانیہ کا غلام ہو گیا تو اُنھوں نے انگریزوں کا سا رنگ روپ اختیار کر لیا۔

جہاں تک ہندوؤں کے مسلمان حکمرانوں کے ساتھ روابط کا تعلق ہے۔ عزیز احمد نے اپنی کتاب کے اسی حصے میں بنوامیہ کے دور سے لے کر اورنگ زیب کے زمانے تک مسلمانوں کی سلطنت میں غیر مسلم وزیروں، مشیروں اور اعلیٰ اختیارات کے مالک انتظامی افسران کی بھاری تعداد شامل رہی ہے۔ محمد بن قاسم نے فتح سندھ کے بعد بہت سے اعلیٰ ہندو منتظمین اور وزراء کو جُوں کا تُوں قائم و دائم رکھا۔ یہاں سے لے کر اورنگ زیب کے دورِ حکومت تک یہی انداز قائم رہا۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اورنگ زیب غیر مسلموں کے ساتھ رواداری کے قائل نہیں تھے۔ عزیز احمد نے مستند ہندو مورخین اور مسلمہ انگریز مورخین کے حوالے سے لکھا ہے کہ اورنگ زیب اپنی انتظامیہ کو فقط اُن کی پیشہ ورانہ مہارت کی بنیاد پر جانچتا پرکھتا تھا۔ اس سلسلے میں انھوں نے ایسی مثالیں بھی پیش کی ہیں جہاں اورنگ زیب نے اپنے مفتوحہ علاقے میں ہندو حکمران طبقہ کی بڑھ چڑھ کر سرپرستی کی اور اُنھیں اُن کے منصب پر نہ صرف برقرار رکھا بلکہ بعض اوقات منصب میں اضافہ بھی کیا۔ یُوں اسلامی ہند میں

آغاز سے انجام تک مسلمان حکمرانوں نے غیر مذہب سے تعلق رکھنے والے قابلِ قدر افراد کی سرپرستی جاری رکھی۔ اس حکمت عملی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی انتظامیہ میں ہندو عناصر خوش اور مطمئن رہے اور یوں یادگار خدمات سرانجام دیتے رہے۔ اس کا اثر ہندوستان میں اسلامی کلچر اور روایات کی مقبولیت پر بھی پڑا اور بہت جلد ہند اسلامی کلچر کے نام سے ایک منفرد کلچر وجود میں آ گیا۔

عربوں کی ہندوؤں کے علوم کی تحصیل

جب ۷۱۸ء سے لے کر ۸۰۰ء تک سندھ مسلم خلافت کا حصہ تھا تب سنسکرت کی تاریخی، تہذیبی اور علمی کتابوں کا مطالعہ مسلمان دانشوروں کے تجسس کی تسکین کا ذریعہ بن گیا تھا۔ عربوں نے خصوصیت کے ساتھ ہندو علوم خصوصا طب اور نجوم کی تحصیل کی خاطر اسی انداز میں علمی تجسس کا مظاہرہ کیا جس انداز میں انھوں نے یونانی علوم حاصل کیے تھے۔ اِس زمانے میں ہندو طبیبوں کو بغداد میں رسائی حاصل ہوئی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب بدھ مت کے پیروکار دائرہ اسلام میں داخل ہو کر برمکی وزراء عباسیوں کے دور میں ہمہ مقتدر تھے۔ الکندی اور بعد ازاں البیرونی نے ہندوستانی تہذیب و معاشرت کا مطالعہ کیا اور یحیی البرمکی نے ہندوستانی طب، مذاہب اور رسوم و رواج کا براہِ راست مطالعہ کرنے کے لیے دانشوں کو ہندوستان بھیجا۔ البیرونی وہ شہرہء آفاق تہذیبی مورخ ہے جس کی تصنیف ''کتاب الہند'' ہندوستان کی تہذیب و معاشرت کا دنیا بھر میں پہلا مطالعہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی دنیا میں Al-Baruni's Indica کے سے مختلف ناموں سے اِس کتاب کے یورپی زبانوں میں تراجم کیے گئے۔ البیرونی ہندو معاشرت پر بات کرتے ہوئے بالعموم یہ کہتا ہے کہ ہم میں اور اُن میں یہ فرق ہے گویا وہ برصغیر کے کونے کونے میں سفر اور جگہ جگہ قیام کے بعد اِس نتیجے پر پہنچا ہے کہ چھوت چھات اور ذات پات کے نظام نے خود ہندو معاشرت کو تقسیم در تقسیم کر رکھا ہے۔ جبکہ توحید پرست معاشرے دیوتاؤں کی اس طبقاتی تقسیم کے تصور کو اپنانے سے انکاری چلے آ رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ہم ہیں اور وہ وہ۔ امیر خسرو ہندوستان سے گہری محبت کے رشتے میں اسیر نظر آتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ وہ ایک ترکی النسل خاندان میں پیدا ہوا تھا اور غالبا اُس کی ماں ہندوستانی تھی۔ اُس نے ہندوستان کو ارضی جنت سے تعبیر کرتے ہوئے ہندوستانی حُسن و جمال کی ثنا خوانی کی ہے۔ بہت سی خوبصورت ہندی شاعری اُس کے نام سے منسوب ہے۔ خسرو نے ہندوؤں کی بُت پرستی کے جواز بھی پیش کیے۔ ہندوستان کی شاعری اور موسیقی کو بڑے فخر سے اپنایا۔ اس خسروئے شیریں کے بعد صدیوں تک کوئی ہندوستان کا ایسا ثنا خواں مسلمان پیدا نہیں ہوا۔

تصوف اور ہندو ویدانت

اس موضوع پر دادِ تحقیق دیتے وقت عزیز احمد نے مغرب کے اُن تمام محققین کے اس نظریے کی تردید کی ہے کہ تصوف کا آغاز و ارتقاء ہندو مت اور بدھ مت کی ویدانت کی روایات کے زیرِ اثر ہوا تھا۔ اُن کا کہنا یہ ہے کہ تصوف کی جڑ بنیاد اسلام ہے۔ تصوف کے تمام تر دبستانوں کا سرچشمہ اسلام ہے۔ جب اسلام جزیرہ نمائے عرب سے نکل کر یورپ، وسط ایشیا اور برصغیر ہند میں پہنچا تو مقامی اثرات و عقائد سے متاثر ضرور ہوا مگر بنیادی طور پر اس کا آغاز اور ارتقاء قرآن حکیم اور حدیث کی تعلیمات ہی رہیں۔ اِس بحث کے اختتام پر عزیز احمد نے بجا طور پر اِس امر کا اعتراف کیا ہے کہ ہندوستان میں تمام صوفی سلسلوں، چشتی، قادری اور نقشبندی نے اوّل اوّل ہندو مت سے دُوری اختیار کی مگر بعد ازاں رفتہ رفتہ پُرامن بقائے باہمی سے ہوتے ہوئے رواداری اور افہام و تفہیم کا ثبوت دیا۔ اِس ضمن میں انھوں نے درست لکھا ہے کہ ہندوستان میں فروغ پانے والے تمام صوفی سلسلوں میں سے قادری سلسلہ سب سے زیادہ وسیع النظر ثابت ہوا۔ ان کی رواداری اور وسیع النظری بالآخر دارالشکوہ اور مرزا مظہر جان جاناں کے اس تصور تک پہنچی کہ وید اللہ کا کلام ہے۔ اس نظریے کی شاہ ولی اللہ، سید احمد بریلوی اور

دیگر نقشبندی صوفیاء نے کھل کر تردید کی اور تصوف کو ہندو ویدانت کے اثرات سے پاک کر دیا۔

تصوف اور ویدانت کے تال میل سے بھگتی تحریک نے جنم لیا۔ یہ تحریک بنیادی طور پر برہمنیت کے خلاف اور اسلام کے لائے ہوئے اخوت و مساوات کے اصولوں پر اُبھری، فروغ پذیر ہوئی اور بالآخر جب ہندوؤں کے نچلے طبقوں نے اخوت و مساوات کے تصورات کی بنیاد پر برہمنیت کو عملی طور پر رد کرنا چاہا تو برہمنوں نے تشدد کے ساتھ اِس تحریک کو ختم کر دیا۔ ہر چند بھگتی تحریک کچل دی گئی تاہم بھگتوں کی شاعری نچلی ذاتوں کے ہندوؤں کو متاثر کرتی رہی مگر یہ پیغام بہت جلد فقط چند بھگتی شاعروں تک محدود ہو کر رہ گیا اور یوں برہمنیت سُرخرو ہوئی۔ بھگتی تحریک کی طرح ہی بابا گورو نانک نے نظریاتی اور عملی طور پر توحید پرستی کی روشن کو اپنا لیا۔ بابا فرید گنج شکر کے سے صوفیاء کی شاعری کو گرو گرنتھ میں شامل کر کے ایک مقدس شان عطا کی۔ حج کو گئے مگر پھر جب اورنگ زیب کے زمانے میں پنجاب میں اِن کے پیروکاروں پر تشدد ہوا تو ردِعمل میں اس صوفی تحریک نے مسلم سکھ جتھوں کی حیثیت اختیار کر لی اور یوں بابا نانک کا صوفیانہ مسلک پس منظر میں چلا گیا۔ علامہ اقبال نے اپنی نظم ''بابا نانک'' میں بجا فرمایا ہے:

پھر اُٹھی صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اِک مردِ کامل نے جگایا خواب سے

بابا گرو نانک اور اُن کے حقیقی پیرو توحید پرست ہوتے ہوئے کسی ذات برادری کی اور برہمن اور شودر کی کسی طبقاتی تقسیم کو خاطر میں نہیں لاتے۔ یہ برصغیر میں مسلمانوں کے عقیدہ و عمل کا بہترین نتیجہ ہے۔ عزیز احمد نے برصغیر کے معاشرے پر اسلام کے اثرات پر اپنی بحث کو سمیٹتے ہوئے عام اعتقادات میں وسیع النظری، رواداری اور وسیع تر بھائی چارے کے فروغ کو لوک گیتوں اور لوک روایات میں بھی پہچانا اور پیش کیا۔

دینِ الٰہی اور اُس کے خلاف نقشبندی ردِعمل

اکبر کے دینِ الٰہی کے خلاف نقشبندی ردِعمل نے اسلامیانِ ہند کو ایک بار پھر اسلام کی حقیقی صورت سے آشنا کرنے کا تاریخی کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ دینِ الٰہی کی ترویج و اشاعت نے وسطِ ایشیا کے حکمرانوں کو اس خطرے کے تدارک پر یوں کمربستہ کر دیا کہ وہاں سے اکبر کو ایک خط کے ذریعے خبردار کیا گیا۔ اِس خط میں یہ پوچھا گیا تھا کہ کیا تم نے اسلام ترک کر دیا ہے۔ اس کے جواب میں اکبر نے انتہائی معذرت خواہانہ انداز میں اس الزام کی تردید کی ہے اور اپنی اسلامی شناخت پر ااصرار کیا۔ اکبر کے اس جواب کے باوجود وسط ایشیا کے حکمرانوں نے دہلی میں پہلی نقشبندی خانقاہ قائم کی اور یوں نقش بندی صوفیاء نے ہندوستان کے طول و عرض میں اسلام اور تصوف پر سے ہندوانہ اثرات کو ختم کرنے کی مہم شروع کر دی۔ اس مہم کے قافلہ سالار شیخ احمد سرہندی تھے۔ اُن کی انہی خدمات کی بدولت مسلمانوں کی علمی، فکری اور دینی زندگی میں اُنھیں مجدد الف ثانی کا مقبولِ خاص و عام لقب حاصل ہوا تھا۔ اُنھوں نے اپنا مشہور ''رسالہ در اثباتِ نبوت'' اِسی معرکہءحق و باطل کے دوران تصنیف کیا تھا۔ دینِ الٰہی کے مبلغین نے اپنی تحریر و تقریر میں یہ ثابت کرنا چاہا تھا کہ آنحضورﷺ کی بعثت کے پہلے ایک ہزار سال مکمل ہونے کے بعد اب اُن کی نبوت عملاً ختم ہو کر رہ گئی ہے اور یُوں الف ثانی میں اکبر کو ولی اللہ کا مقام حاصل ہو گیا جو اپنے قول و عمل سے یہ ثابت کرنے میں مصروف ہے کہ رام اور رحیم ایک ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی نے اپنی اصلاحی اور تبلیغی کوششوں سے یہ ثابت کیا کہ رام اور رحیم یعنی ہندو اور مسلمان ایک نہیں ہیں۔ رام ایک آدمی کا بیٹا ہے جبکہ رحیم خالق کائنات ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی کی تعلیمات کے زیرِ اثر ہندوستان میں نقشبندی تصوف کا فروغ و ارتقاء انتہائی تیزی سے عمل میں آیا۔ خود شاہ جہاں کے دو بیٹوں دارالشکوہ اور اورنگ زیب میں یہی سوال اختلاف اور جنگ کا سبب بن گیا تھا۔ دونوں بھائی

میدانِ جنگ میں ایک دوسرے کے خلاف صف آراء ہو گئے تھے - مسلمانوں کی بھاری اکثریت نے اورنگ زیب کا ساتھ دیا اور یوں داراالشکوہ اور اُس کے ویدانتی اسلام کو حقیقی اسلام نے شکستِ فاش سے دوچار کر دیا تھا -

دینِ الہیٰ کے خلاف نقشبندی ردِعمل کے اثرات اٹھارہویں صدی کی دو ایسی شخصیات پر مرتب ہوئے جن کی علمی اور رُوحانی خدمات نے دینِ الہی کے سے طرزِ فکر کو ہمیشہ کے لیے ختم کر کے رکھ دیا- یہ دو شخصیات خواجہ میر درد اور شاہ ولی اللہ دہلوی ہیں- خواجہ میر درد نے تصوف و حکمت پر اپنی فارسی تصنیفات میں زور دار استدلال کے ساتھ نقشبندی تصوف میں طریقہ محمدیہ ﷺ کی بنیاد رکھی اور اپنی شاعری اور اپنی صوفیانہ سرگرمیوں سے دین و تصوف میں نئے طرزِ فکر و عمل کو اپنے مریدین کے حلقے سے لے کر اپنی شاعری اور اپنے تصوف کے ذریعے فروغ دیا- اِس کے ساتھ اپنے والد کے قائم کردہ مدرسہء رحیمیہ میں درس و تدریس کے ذریعے نقشبندی مسلک اور ہندوستان کے خاص حالات میں طریقۂ محمدیہ کے قبولِ عام کی صورت پیدا کی- عزیز احمد نے اپنی کتاب میں "The Wali-Ullahi Movement" کے عنوان سے شاہ ولی اللہ کے دینی اور سیاسی تصورات کی روشنی میں سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل شہید کی تحریکِ مجاہدین کے کارناموں پر اپنی بحث ختم کی ہے- اگلا باب تہذیب و ثقافت اور زبان و ادب کے موضوع پر ہے-

اس باب میں مسلمانوں کی جانب سے سنسکرت ادب کی سرپرستی، فارسی ادب کے فروغ اور مسلمانوں کے عہدِ اقتدار میں ہندوؤں کی جانب سے فارسی ادب کی تحصیل اور فروغ کا جائزہ پیش کیا ہے اور اسی بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے اُردو اور ہندی کے لسانی جھگڑے کے پس پردہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے جداگانہ اندازِ فکر و نظر کا تجزیہ کرتے ہوئے زبان و ادب کی جداگانہ شناخت پر ہندو مسلم اصرار کو بالآخر دو جداگانہ قوموں کے وجود پر اصرار میں بدلتا ہوا دکھایا ہے اور یُوں اس حقیقت افروز تجزیہ کو قیامِ پاکستان پر منتج قرار دیا ہے- کتاب کا آخری باب درج بالا مباحث کے تسلسل ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک یعنی مسلمانوں کے سیاسی زوال سے لے کر قیامِ پاکستان تک کے مباحث پر مشتمل ہے- عزیز احمد کے اِس تجزیاتی مطالعے سے پاکستان کا قیام برحق نظر آتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ برٹش انڈیا کا یہی انجام کہ ہندو اور مسلمان اپنی اپنی اکثریت کے علاقوں میں آزاد اور خودمختار قوموں کی حیثیت سے زندہ رہیں، برحق نظر آتا ہے -

عزیز احمد نے ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے لے کر قیامِ پاکستان تک کا سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی تجزیہ اِس تخلیقی انداز سے کیا ہے کہ اُن کی اس کتاب کا کوئی بھی غیر جانبدار قاری قیامِ پاکستان کی ناگزیریت پر ایمان لے آئے گا- خوبی کی بات یہ ہے کہ اِس نتیجے پر وہ ایک سائنسی اندازِ نظر کے ساتھ حقائق کے غیر جانبدارانہ تجزیے سے پہنچے ہیں- اِس کتاب کا اصل موضوع سیاسی نہیں تہذیبی ہے اور عزیز احمد نے برصغیر میں مسلمانوں کے آ کر آباد ہو جانے اور پھر حکومت چھن جانے کے بعد انگریزوں کے مسلط ہو جانے اور بالآخر اس تسلط کے خاتمے تک ہندوؤں اور مسلمانوں کے الگ الگ ممالک کا قیام بالکل فطری نظر آتا ہے- کتاب کا ہر قاری اِس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ عزیز احمد نے تہذیب و ثقافت کو سیاست کی نظر سے دیکھنے کے بجائے سیاست کو تہذیب و ثقافت کے آئینے میں دیکھا اور دکھایا ہے -

جہاں تک عزیز احمد کے متذکرہ بالا معاصر محققین کا تعلق ہے وہ ہر دورِ سلطنت کو اپنا مرکز بنا کر دادِ تحقیق دیتے رہیڈ غزنوی دورِ حکومت سے لے کر سلاطینِ دہلی اور مغل سلاطین کے مختلف ادوارِ حکومت کو حکمرانوں کے نقطۂ نظر سے پیش کرتے ہوئے اُن کے کارناموں میں چند ایسی اصلاحات کا ذکر بھی کر دیتے ہیں جو درباروں سے اور اقتدار کی سازشوں سے دور بہت دُور بیٹھی ہوئی رعایا کے سیاسی، تہذیبی اور دینی مقدر کی طرف بھی اشارے کر دیتے ہیں ڈ اس کے برعکس عزیز احمد تہذیب و ثقافت کو مرکزی حیثیت دیتے ہوئے اپنے موضوع کو مختلف حصوں میں تقسیم کرتے ہیں اور پھر ہر حصے میں دین و مذہب اور تہذیب و

ثقافت کو مرکزی حیثیت بخش دیتے ہیں۔ ہندوستان کے مسلمان بیرونِ ہند کی ملتِ اسلامیہ سے کن گہرے اور اٹوٹ رشتوں میں منسلک ہیں، اِس سوال پر عزیز احمد ہی نے ایک گہری تجزیاتی نگاہ ڈالی ہے۔ اِسی طرح ہندوستان میں اپنی بُود و باش کے دوران مسلمانوں نے ہندوستان میں آباد مختلف مسالک کے غیر مسلم باشندوں کی تہذیب و ثقافت سے کیا سیکھا اور مسلمانوں سے مقامی باشندوں نے کیا سیکھا۔ یہ سوالات بڑی گہرائی کے ساتھ زیرِ بحث لائے گئے ہیں۔ عزیز احمد کا کمال یہ ہے کہ وہ اس مقالے کے آغاز میں دی گئی دیگر مصنفین کی کتابوں کے برعکس تہذیب و ثقافت کو اپنا مرکزِ نگاہ بنا کر پاکستان کے قیام کو برصغیر میں مسلمانوں کے ہزار سالہ تاریخی سفر کا بالکل فطری نتیجہ قرار دیتے ہیں۔

☆☆☆

حواشی

(1) **Influence of Islam on Indian Culture, Reprinted in Pakistan, Lahore, 1978, p.III**

۲۔ تمدنِ ہند پر اسلامی اثرات، ڈاکٹر تارا چند، ترجمہ: محمد مسعود احمد، لاہور، طبع دوم، ۲۰۰۲ء، صفحہ ۱۲

(3) **Muslim Civilization in India, New York, 1964, p.296**

(4) **Islamic Culture in the Indian Environment, Oxford, 1964, p.68**

(5) **Ibid, p.77**

(6) **The Muslim Community of the Indo-Pakistan Subcontinent, Mouton & Co. 1962, S-Gravenhage, Pp.38-39**

(7) **New York, 1964, p.21**

(8) **Influence of Islam on Indian Culture, Tara Chand, Lahore, 1978, p.46**

(9) **Tanqeed ka Nia Pasmanzar, Lahore, 1964**

(10) **Ibid, p.78**

(11) **Ibid, p.93**